التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی، جلد ۶، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

محمد اسد (Former: Leopold Wesis)

سید محمد کاشف

Present article in hand is about one of the great personalities in the series of renaissance of Muslim ummah, Muhammad Asad no doubt fits in that list. He was a Jewish converted Muslim belonging to a Rabbi Family of Austria Lwow. Reason behind his accepting Islam was his influence with the culture of Arab society though it was on declining path. Finally he gets inspired and fully intended to accept Islam as a religion, without having any confusion and hesitation. For this he paid high cost of trailing all his relations including his parents but nothing could make his decisionchange.

When he was on his journey to Asian's countries, he visited Indo-Pak subcontinent, and became a part of them. Allama Iqbal was the first

man who convinced him to stay there. All famous religious personalities like Shibli Nomani, Maulana Mawdoodi etc admired his intelligence and sincerity with Islam. He played a vital role in Pakistan's movement. he wrote a great piece of work for Muslim Ummah during this movement. He also published a magazine with the title of Arafat.

He was the first Pakistani, who was issued a Pakistani passport. Thoroughout his life, he tried tirelessly for the wellbeing of Pakistan, but unfortunately he was not only suspended to work for Pakistan, but was also erased from the whole history of Pakistan's movement intentionally. Last but not the least he set an example for whole Muslims youth that only a person could do more than a group with having firm believe in religion and with trust on Allah.

ابتدائیہ

احیائے اسلام یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں گزشتہ چند صدیوں میں بہت سی تحریکیں اور شخصیتیں ابھری ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔اس ناکامی کے اسباب مختلف ہیں مگر بنیادی سبب تقلید محض کی فکر ہے۔بہر حال قابل قدر کامیابی نہ حاصل ہونے کے باوجود ان سب نے اپنے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔انہی شخصیات میں بیسویں صدی کے محمد اسد بھی ہیں۔جو کہ ایک یہودی ربی کے گھر پیدا ہوئے مگر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ان کے قبول اسلام کی بنیادی وجہ عرب اسلامی تہذیب بنی باوجود اپنی خستہ حالی اور کھوکھلے پن کے۔اور اس تہذیب نے مغرب کے پروردہ کو بغاوت پر آمادہ کیا اور اپنی ہی تہذیب سے روگردانی کرکے کسی اور ہی تہذیب کا علمدار بنادیا۔

محمد اسد نے اسلام اور مسلمانوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔اس مطالعہ کا موقع انھیں اپنی صحافتی زندگی میں عرب مسلم ممالک میں ٹھہرنے کے سبب حاصل ہوا۔اور مسلم تہذیب کی ہم آہنگی جس کی بنیاد ولن ،رنگ ونسل پر نہیں ہے بلکہ فکری بنیاد پر ہے ،اس ہم آہنگی کی بنیاد نے یہودی ربی کے بیٹے پر اسلام کے در وا کردیئے اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اپنی سیاحتی زندگی میں سعودی عرب میں پانچ سال گزارنے کے بعد محمد اسد نے ہندوستان،چین وغیرہ کے دورے کا آغاز کیا اور جب وہ ہندوستان پہنچے تو اس وقت ہندوستان کی فضاء میں تحریک آزادی کی گونج جاری تھی۔ان حالات میں شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال نے ان سے ہندوستان میں ہی قیام کی درخواست کی۔اور ان کی اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے محمد اسد یہیں کے ہوگئے اور مرتے دم تک پاکستانی کی حیثیت سے زیست کا سفر مکمل کیا۔

محمد اسد نے گو کہ ہر لحاظ سے ایک مصلح ،مجتہد،اور لی لیڈر کا کردار ادا کیا،لیکن وہ ان میدانوں میں خاطرخواہ کامیاب نہ ہوسکے، جس کی ایک وجہ تو زبان کا فرق Communication Gap تھا۔ان کی تمام علمی کتب انگریزی زبان میں تھیں جس سے مسلمانوں کی اکثریت ناواقف تھی۔پھر ایک وجہ مسلمانان ہند کا عمومی رویہ تشکیک کہ جس نے انہیں پذیرائی نہ حاصل ہونے دی۔الغرض دیگر علمی وعملی شخصیات کی طرح پاکستان میں اور بالخصوص تحریک پاکستان کے ضمن میں (Intentionaly)ان کی شخصیت کو گوشہ گمنامی میں پہنچادیا ،تاکہ مسلمان نہ تو ان کے افکار سے واقف ہوسکیں اور نہ ہی یہ سمجھ سکیں کہ آخر اس امت کے زوال کے اسباب کیا ہیں ۔

سوانح:

نومسلم محمد اسد(سابق لیوپولڈ وائس)بیسویں صدی (1900)کے آغاز ہی میں آسٹرو ہنگرین ایمپائر کے ایک دور افتادہ علاقہ میں پیدا ہوئے اور طویل عمر پاکر اسی صدی کی آخری دہائی میں سپین کے ایک چھوٹے سے شہر(غرناطہ) میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے (20th Febeurary,1992)۔یوں دیکھیں تو محمد اسد کی ذات قریب قریب پوری ایک صدی کا آئینہ ہے،جس میں اس دور کے نمایاں فکری رجحانات،علمی سطح پر مشرق ومغرب کی

آویزش اور ان کے تہذیبی بعد کو کم کرنے کی مختلف النوع کوششوں، دنیائے اسلام کو درپیش کوناکوں مسائل اور مروجہ سیاسی میلانات کی جھلک منعکس ہے۔

محمد اسد یہودیوں کے جانے پہچانے مبلغ خاندان کے چشم وچراغ تھے۔اسی ماحول میں ان کی چشم شعور وآگہی وا ہوئی۔اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ صرف 13سال کی عمر میں وہ عبرانی زبان میں گفتگو کرنے لگے تھے اور روانی سے اسے پڑھ بھی لیتے تھے۔آرامی زبان سے بھی وہ آشنا تھے اور تالمود اور بائبل کا عہد قدیم بآسانی پڑھ سکتے تھے۔(1)

پہلی جنگ عظیم 28جولائی 1914 کو شروع ہوئی اور 11نومبر 1918 کو ختم ہوئی۔اس وقت محمد اسد کی عمر چودہ سال تھی اور وہ ایک مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کررہے تھے،لیکن مدرسے کی تعلیم سے انہیں دلی لگاؤ نہ تھا۔وہ گھر سے بھاگے اور آسٹریا کی فوج میں کسی اور نام سے بھرتی ہوگئے۔والد کو پتہ چلاتو فوج کے متعلقہ افسر سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ یہ بچہ کم عمر ہے،اس لئے اسے فوج میں بھرتی نہیں کیا جاسکتا،چنانچہ انہیں واپس گھر بھیج دیا گیا۔(2)

اسی اثناء میں محمد اسد کے والد ویانا چلے گئے اور آپ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ۔جنگ ختم ہونے کے بعد محمد اسد نے ویانا یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں فلسفہ،تاریخ اور آرٹ کو موضوع مطالعہ بنایا۔انہی دنوں وہ فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہوئے،لیکن یہ ان کے ذہنی اور فکری رجحانات کی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔اب ان کا احساس جاگ اٹھا تھا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ تمام یورپ روحانی اضطراب کا شکار ہے اور ان لوگوں نے اپنی زندگیوں کو مادی وسائل کے حصول کے لئے وقف کررکھا ہے اور دنیاوی خواہشات کی تکمیل ہی ان کا اصلی نقطہ نظر ہے۔اسد کو اب حق کی تلاش تھی اور اس تلاش میں وہ انتہائی بے قرار تھے۔وہ یہودیت اور عیسائیت وغیرہ مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے،لیکن انہیں قلبی سکون اور ذہنی اطمینان حاصل نہ ہورہا تھا ۔اس بے چینی کا اثر یہ ہوا کہ یونیورسٹی کی تعلیم جاری رکھنا ان کے بس میں نہ رہا اور انہوں نے میدان صحافت میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔(3)

بالآخر خاصی تگ ودو کے بعد انہیں جرمنی کے ایک اخبار میں ملازمت مل گئی اور وہ اس کے نامہ نگار کی حیثیت سے مشرق وسطی کے بلاد اسلامیہ کے حالات حاضرہ کے متعلق تجزیاتی

رپورٹیں بھیجنے نکل کھڑے ہوئے۔برسوں وہ فلسطین سے افغانستان تک اپنے فرائض منصبی ذمہ داری اور دیانتداری سے ادا کرتے رہے۔ان کی ارسال کردہ روداد وں کا کچھ حصہ کتابی صورت میں منظر عام پر آگیا ہے،جس کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ان اسلامی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کا کس قدر باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔اپنی صحافتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس شب وروز کی بادیہ پیمائی نے انہیں مسلمانوں کی عمومی زندگی سے تو آشنا کردیا،لیکن ابھی وہ امن وسلامتی کے دین یعنی اسلام کی اصل روح تک رسائی حاصل نہ کرسکے تھے۔بہرحال ان اسفار نے ان کے قلب میں نرمی اور گداز پیدا کردیا اور انہوں نے جب ام الکتاب یعنی قرآن حکیم کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو انہیں دائرہ اسلام میں داخل ہونے میں کسی ذہنی یا جذباتی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔اس تبدیلی دین سے ان کے تمام خاندانی رشتے ناتے ٹوٹ گئے۔لیکن انہوں نے اس کی ذرہ بھر پروانہ کی اور اپنی نومسلم جرمن بیوی اور اس کے معصوم بچے کو لے کر حرمین شریفین کی جانب چل پڑے۔مکہ پہنچتے ہی جرمن بیوی داغ مفارقت دے گئی۔لیکن انہوں نے پامردی سے ہر طرح کے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔

اپنے قبول اسلام کے ضمن میں وہ ان واقعات کا ذکر کرتے ہیں جس نے انہیں حد سے زیادہ متاثر کیا،ان واقعات میں وہ عرب معاشرت کے بنیادی اخلاقی رویوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ جس نے ان کی بے چین روح کو قرار کی جائے پناہ تک کی راہ سجھائی۔جب وہ بذریعہ ٹرین اسکندریہ سے بیت المقدس جارہے تھے تو ان کے ہم سفر ایک عرب بدو نے کسی اسٹیشن سے روٹی خریدی۔اس نے روٹی کے دو ٹکڑے کیے اور ایک میری (محمد اسد) جانب بڑھادیا،میں نے لینے میں تامل کیا تو اس نے مسکرا کر کہا کہ جب ہم دونوں ہی مسافر ہیں اور ایک ہی راستے پر اکٹھے چل رہے ہیں تو یہ بیگانگی کیوں؟۔(4)اسی طرح وہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ مصر (1923)میں تھے اور جس جگہ ان کی رہائش تھی وہیں قریب میں مسجد بھی موجود تھی تو روزانہ صبح شام موذن کی آواز اور مسلمانوں کو نماز پڑھنے جاتا دیکھتے تو وہ سوچتے کہ ،یہ طے شدہ بات ہے کہ اسلامی ممالک میں ہر جگہ یہی لہجہ اور یہی آہنگ مجھے ملے گا۔اس فرق کے باوجود جو مختلف

مقامات کی مقامی زبانوں اور لہجوں میں ہوتا ہے،ایک ایسا صوتی اتحاد اور یگانگت جسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد، یکسانیت ،اور ہم آہنگی کتنی گہری ہے اور ان کو تقسیم اور متفرق کرنے کی چیزیں کتنی مصنوعی ،سطحی اور بے اثر ہیں۔اپنے عقیدے،طرز فکر حق وباطل کی تمیز بہتر اور صحیح زندگی کے مزاج اور بناوٹ کو سمجھنے میں وہ ایک انسان کی مانند تھے مجھے پہلی بار ایسا لگا کہ میں نے ایک ایسی سوسائٹی میں رکھا ہوں جس میں انسان کے درمیان رشتہ اور تعلق کی بنیاد اقتصادی مصالح یا رنگ ونسل پر نہ تھی،بلکہ اس سے زیادہ گہری مضبوط اور پائیدار چیز پر تھی، وہ زندگی کے متعلق اس مشترک نقطہ نظر کا رشتہ تھا جس نے دو انسانوں کے درمیان سے بیگانگی اور بے تعلقی کی تمام دیواروں کو گرادیا تھا۔(5)

سعودی عرب میں اپنے پانچ سالہ قیام (1927-1932)کے دوران میں انہیں وہ سب کچھ ملا، جس کی ایک انسان خواہش کرسکتا ہے۔سب سے بڑی تو ایمان کی دولت تھی جو پروردگار نے انہیں فراوانی سے عطا کردی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ہی پروردگار نے انہیں ایک سیلانی روح بھی دے رکھی تھی۔جو انہیں کہیں جم کر نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔بالآخر اس سیلانی روح نے انہیں ایک بار پھر سیاحتی سفر کے آغاز پر مجبور کیا اور وہ اپنی عرب بیوی اور شیر خوار بچے کو لے کر چین ہشرقی ترکستان وغیرہ کی سیاحت کو چل پڑے۔اس طویل سفر کا پہلا پڑاؤ ہندوستان تھا۔خوش قسمتی سے یہاں ان کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی،جنھوں نے اپنی چشم بینا سے اس نومسلم اور نووارد کے قلب وذہن میں پوشیدہ نظری جوہر کو پہچان لیا اور اسے ایک ایسی راہ سجھائی ،جو اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔اقبال کے مخلصانہ مشورے کا فوری اثر یہ ہوا کہ اسد جن ممالک کی سیاحت کے لیے رخت سفر باندھ کر چلے تھے وہ کہیں کونے میں ہی پڑا رہ گیا اور انہوں نے اپنے قوائے ذہنی وباطنی دین اسلام کی خدمت اور اپنے خیر خواہ یعنی اقبال کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے لیے وقف کردیئے۔

سید سلیمان ندوی اسد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہم کو اپنے تمام نومسلم بھائیوں میں سے سب سے زیادہ جس شخصیت نے متاثر کیا ہے وہ آسٹریا کے ایک گمنام نومسلم لیوپولڈوائس معروف بہ محمد اسد ہیں۔وہ ایک ایسے نومسلم نظر آئے جن کو دیکھ کر مغرور پشتینی

مسلمانوں کو شرمانا چاہیے۔ وہ نہ صرف عقیدہ کے مسلمان ہیں ،بلکہ فرائض وسنن ومستحبات اور تمدن ومعاشرت تک میں مسلمان ہیں۔ یہ وہ یورپین ہیں جو نہ صرف مسیحی عقیدہ کے بلکہ یورپین تمدن کے بھی مخالف ہیں۔(6)بقول مولانا مودودی ......دور جدید میں اسلام کو جتنے غنائم یورپ سے ملے ہیں، ان میں محمد اسد سب سے قیمتی ہیرا ہیں۔ اور اس ہیرے کو جس جوہری نے سب سے پہلے پہچانا، وہ علامہ اقبال تھے۔(7) جب اسد نے برصغیر ہی میں مستقل قیام کا فیصلہ کرلیا تو اقبال کو ان کے لیے کوئی ڈھب کی ملازمت تلاش کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ انہوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ انہیں اسلامیہ کالج (لاہور) کے شعبہ اسلامیات کا سربراہ مقرر کردیا جائے لیکن وہ بعض وجوہ کے سبب کامیاب نہ ہوسکے۔ ابتدائی ملاقاتوں میں اقبال نے اسد کو صحیح بخاری کے انگریزی ترجمہ وتشریح کی تجویز پیش کی ،جس کو اسد نے قبول کرتے ہوئے اس کو ایک بڑے منصوبے کی حیثیت سے شروع کردیا۔ صحاح ستہ کے کسی مجموعہ احادیث کو انگریزی میں منتقل کرنے کی یہ اولین کوشش تھی۔ ترجمہ کے علاوہ اس کے طباعتی اخراجات کے لئے اقبال نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اوراکبر حیدری کے توسط سے نظام دکن سے خاصی معقول رقم کا بندوبست ہوگیا۔ اس کے بعد ترجمہ وطباعت کے مراحل بلارکاوٹ تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔

انہی دنوں اقبال کی تجویز پر دارالسلام (جمال پور، پٹھان کوٹ) کے قیام کا مسئلہ زیر غور تھا اور اقبال چاہتے تھے کہ ان کے اس brain-child کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اسد ہی کو سونپی جائے ،لیکن حیدرآباد دکن کے انگریزی سہ ماہی مجلہ **اسلامک کلچر** کا مدیر مقرر ہونے کی وجہ سے انہیں اقبال سے معذرت کرنا پڑی چنانچہ مولانا مودودی کو اس عہدے کے لئے نامزد کردیا گیا۔ روز بروز بڑھتی ہوئی علالت کے باعث اقبال جمال پور میں قائم ہونے والے ادارے کے لیے زیادہ فعال کردار ادا نہ کرسکے ،لیکن اسد کی مشاورت اور اولین رکن ہونے کی حیثیت سے ہونے والی پیش رفت سے انہیں مطلع کرتے۔ ساتھ ساتھ لاہور میں مقیم جرمن ڈاکٹروں سے اقبال کا علاج بھی کراتے رہے،لیکن ایک روز اپنے ہی قائم کردہ پریس میں مصروف کار تھے کہ انہیں اقبال کے انتقال پرملال کی خبر ملی تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گرد تاریکی کے بادل چھاگئے ہوں۔(8)

اقبال تو اس دار فانی سے رخصت ہوگئے ،لیکن انہوں نے اسد کو جو راہ سجھادی تھی، ایک تلمیذ رشید کی طرح وہ اس پر گامزن رہے۔ اقبال کی فرمائش پر انہوں نے صحیح بخاری کا جو انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا، وہ اسی کو آگے بڑھانے میں مصروف رہے۔ ان کا ارادہ اسے چالیس حصوں میں مکمل کرنے کا تھا،لیکن ابھی اس کے پانچ حصے ہی اشاعت پذیر ہوئے تھے کہ دوسری جنگ عظیم چھڑگئی اور انہیں گرفتار کرکے ہندوستان میں مقیم ہزاروں جرمن اور اطالوی قیدیوں کے کیمپ میں نظر بند کردیا گیا۔(یکم ستمبر 1939)ان کے نجی پریس کو تالا لگادیا گیا۔ صحیح بخاری کے ترجمہ کے مسودات وہیں پڑے رہے۔ بیوی اور بیٹے نے چودھری نیاز علی خان کے گھر پناہ لی۔ طویل نظر بندی کے بعد انہیں جب رہا کیا گیا (14اگست،1945)تو ہندوستان کا سارا منظر نامہ ہی تبدیل ہوچکا تھا۔ وہ چاہتے تو صحیح بخاری کے ادھورے کام کو دوبارہ شروع کرسکتے تھے، لیکن اب حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرچکے تھے کہ انہوں نے اس منصوبے کو موخر کردیا اوراقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے جس علیحدہ مملکت کا خواب دیکھا تھا، اس کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ وہ بمبئی کے قریب واقع نظر بندوں کے کیمپ سے رہا ہوتے ہی ڈلہوزی (موجودہ ہماچل پردیش، بھارت) پہنچے اور آتے ہی عرفات کے نام سے سہ ماہی انگریزی مجلہ کا اجراء کیا۔ جولائی 1947 تک اس مجلہ کے اکثر مضامین اسد ہی کے تحریر کردہ تھے۔ ان مضامین کے سرسری مطالعہ سے ہی اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اقبال نے اسد کو جس منزل کی نشاندہی کی تھی، وہ انہیں اب بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے اس مجلہ کا جو نام رکھا یعنی عرفات اس میں بھی اقبال کی سوچ کارفرما ہے یعنی اتحاد بین المسلمین یا پاسبانی حرم کے لئے کرہ ارض پر بسنے والے تمام مسلمانوں کا یکجا ہونا۔ ان کی نظر میں یہ صرف ایک ایسا وسیع وعریض میدان نہیں ہے، جہاں حجاج کرام اکٹھے ہوتے ہیں ،بلکہ یہ ایک علامت ہے ،پوری دنیا کے مسلمانوں کی باہمی اخوت، بھائی چارے، یگانگت اور ایک جگہ اکٹھے رہنے کی۔

محمد اسد اپنے دیرینہ دوست مولانا مودودی، ان کے چند رفقاء اور دیگر ساتھیوں کو بذریعہ ٹرک جمال پور، پٹھان کوٹ سے بحفاظت لاہور لے آئے۔ یہاں پہنچتے ہی انہوں نے نجی

سطح پر اور پھر حکومت پنجاب کے قائم کردہ محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے نئی اسلامی مملکت کے دینی نظریاتی اور آئینی تقاضوں کو پورا کرنے پر فوری توجہ دی۔ستمبر 1947میں انہوں نے ریڈیو پاکستان (لاہور سینٹر) سے جو سات تقریریں نشر کیں،ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استحکام پاکستان کے لیے کن عوامل کو لازمی قرار دیتے ہیں۔اپنے محکمہ سے انہوں نے جس مجلّہ کا اجراء کیا،اس کا نام بھی عرفات رکھا۔اس کا ایک ہی شمارہ شائع ہوا اور اس میں بھی انہوں نے آئین سازی پر ایک طویل اور فکر انگیز مقالہ لکھا،جس میں ایک نئے اسلامی ملک کی بنیادی دستاویز یعنی آئین کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔بدقسمتی سے ہم اس خاکے میں رنگ نہ بھر سکے اور برسوں یہ سرزمین بے آئین رہی، حالانکہ محمد اسد چاہتے تھے کہ اس اہم مسئلہ کو ایک ڈیڑھ برس میں نپٹا دیا جائے۔

محمد اسد اگر مذکورہ بالا محکمہ میں کچھ دیر اور سربراہ رہتے تو شاید یہ کام بھی کر جاتے، لیکن پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے انہیں فوراً وزارت خارجہ میں ایک اہم عہدے پر تعینات کردیا اور پھر انہیں اقوام متحدہ میں بطور مختار کل سفارت کار امریکہ بھجوادیا گیا۔یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ وزارت خارجہ میں ملازم ہونے تک اس کے پاس ان کے آبائی ملک یعنی آسٹریا کا پاسپورٹ تھا۔لیکن جب انہیں ایک سرکاری وفد میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت سے ایک اہم ذمہ داری سونپ کر مشرق وسطی کے اسلامی ممالک بھیجا جانے لگا،تو انہوں نے اپنے افسران بالا کو متوجہ کیا کہ ان کے پاس ابھی تک آسٹرین پاسپورٹ ہے اور انہیں یہ عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ اس پاسپورٹ پر پاکستان کی نمائندگی کی جائے۔چنانچہ لیاقت علی خان کی خصوصی ہدایت پر انہیں جو پاسپورٹ جاری کیا گیا۔اس پر پاکستانی شہری درج تھااور یہ پہلا پاسپورٹ تھا جو تشکیل پاکستان کے بعد کسی شہری کو دیا گیا۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسد پہلے شخص ہیں، جن کو پاکستانی پاسپورٹ جاری ہوا،اور انہوں نے بھی اس کی یوں قدر کی کہ مرتے دم تک اپنی اس پاکستانی شہریت سے دستبردار نہیں ہوئے۔

وزارت خارجہ میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے انہوں نے نوزائیدہ مملکت پاکستان کے دیگر اسلامی ممالک بالخصوص سعودی عرب سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے میں جو خدمات

سرانجام دیں ،وہ لائق صد تحسین ہیں۔افسوس کہ وہ زیادہ دیر تک اس ملک سے اپنے سرکاری تعلق کو برقرار نہ رکھ سکے، ان کے اردگرد سازشوں اور بے بنیاد افواہوں کا ایک ایسا جال بچھادیا گیا ،کہ اس سے رہائی کے لیے ان کے پاس سوائے مستعفی ہونے کے اور کوئی متبادل راستہ نہ رہا۔رہی سہی کسر پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد نے پوری کردی ،جن کی دعوت پر وہ لاہور میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لیے پون برس تک انتھک محنت کرتے رہے اور ان کی امریکی بیوی پولا حمیدہ اسد (م۔2007)بطور سیکریٹری ان کے ساتھ بلا تنخواہ کام کرتی رہی۔تعجب ہے کہ جب تمام انتظامات مکمل ہوگئے اور مختلف ممالک کے مدعوئین کو ہوائی ٹکٹ بھی ارسال کردیئے گئے تو انہیں بیگم سمیت استعفیٰ دینے پر مجبور کردیا گیا۔اس پر مستزاد یہ کہ جب اس کانفرنس کی روداد اور پیش کردہ مقالات کتابی صورت میں شائع ہوئے (1960)تو اس میں محمد اسد کا کہیں نام تک موجود نہ تھا۔ان کے محبوب ترین ملک یعنی پاکستان کے اس طرز سلوک نے انہیں چونکا تو دیا۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی آرزوؤں کے اس مسکن سے ایام جوانی میں جو جذباتی تعلق قائم کیا تھا ،اس میں فرق نہیں آنے دیا۔ادھر سے وقفے وقفے سے گرم ہوائیں تو چلتی رہیں،لیکن محمد اسد نے ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس خطے سے اپنی محبت کی شمع کو روشن رکھا۔دیکھا جائے تو وہ حقیقی معنوں میں محسن پاکستان تھے اور انہیں بلاشبہ Intellectual Founder of Pakistan کہا جاسکتا ہے۔

پولا حمیدہ اسد اپنی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں لکھتی ہیں :

انہیں پاکستان دل وجان سے عزیز تھا۔وہ تصور پاکستان سے محبت کرتے تھے ، حالانکہ اس ملک نے ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اپنایا،لیکن وہ کبھی اس طرز سلوک کے شاکی نہیں رہے، وہ پاکستان کے پہلے شہری تھے اور آخری عمر تک انہوں نے پاکستان کے ساتھ گہرا تعلق قائم و دائم رکھا۔

پاکستان کے علاوہ اسد اگر کسی اور ملک سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے تو وہ سعودی عرب تھا۔کیونکہ بقول پولا صاحبہ پاکستان سے ان کی محبت کا تعلق دماغ سے تھا اور سعودی عرب سے دل کا۔ان کی بہت سی یادیں اس ارض پاک سے جڑی ہوئی تھیں۔ان کی پہلی نومسلم جرمن

بیوی کا مکہ میں انتقال ہوا(1927)اور اسے وہیں دفن کرنا پڑا۔دوسری بیوی منیرہ بنت حسین (م۔1976)کا تعلق یمن کے ایک قبیلہ سے تھا۔جس کے بطن سے مدینے میں خلال کی ولادت ہوئی (1932)سعودی عرب کے بانی شاہ عبدالعزیز بن سعود (م۔1953)انہیں اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے وہاں کے شاہی خاندان بالخصوص شاہ فیصل نے ان کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔سعودی عرب میں اپنے پانچ سالہ قیام میں متعدد بار سوخ اشخاص سے ان کے دوستانہ مراسم تھے،لیکن ان سب سہولتوں اور آسائشوں کے علی الرغم انہیں اس ملک سے نظری لگاؤ تھا۔جب بھی وہ یہاں آتے مغربی لباس پہننا چھوڑ دیتے عربی زبان ہی میں گفتگو کرتے اور یہاں کے طرز زندگی کو اپنا لیتے۔پولا حمیدہ اسد نے تو ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی روح بدوی تھی اور صحرا کی تاحدنظر پھیلی ہوئی دنیا میں خود کو یوں محسوس کرتے ،جیسے اپنے ہی گھر میں مقیم ہیں۔جوانی میں اسد جرمنی کے ایک اخبار Frankfurter (Allgemeine) Zeitung میں بطور نمائندہ برائے مشرق وسطی ملازم رہے۔اسی اخبار کے معتبر لکھاری کارل گیئٹر سیمون نے ان کی وفات سے چار سال قبل دونوں میاں بیوی کا انٹرویو لیا۔سیمون کے ایک سوال کے جواب میں پولا صاحبہ نے کہا:

(9) ۔He is a Bedouin, who have always wandered.

تصنیفات:

Road to Makkah (Published in 1954)

یہ کتاب بارہ ابواب پر مبنی ہے اور وہ درج ذیل ہیں،

پیاس، آثار شاہراہ، ہوائیں، آوازیں، روح وجسم ،خواب، درمیان، اجنہ، فارسی خطوط،دجال، جہاد، اختتام شاہراہ

The Message of the Quran

Translation and Commentry on Sahih Bukhari(Five Parts)

This Law of Ours

Islam at the Crossroads (Published in 1934)،

یہ کتاب 141 صفحات اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور وہ آٹھ ابواب یہ ہیں۔

1. The Open Road of Islam; اسلام کا کھلا راستہ

2. The Spirit of the West; مغرب کی روح

3. The Shadow of the Crusades; صلیبی جنگوں کے سایہ

4. About Education; کچھ تعلیم کے بارے میں

5. About Imitation; کچھ تقلید کے بارے میں

6. Hadith and Sunnah; حدیث اور سنت

7. The Spirit of Sunnah; سنت کی روح

8. Conclusion.

9.The Principles of State and Government In Islam

ہم پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟(مجلہ عرفات ،مئی 1947)

پاکستان کی انفرادیت، فرادیت اور خودفہمی،فیصلہ کی گھڑی آن پہنچی ،ہمارا اخلاقی قدوقامت،پاکستان کی تعمیر قیادت اور عوام میں عدم یکسانیت۔اس مضمون کے بنیادی نکات ہیں۔(10)

اسلام کیا کہتا ہے؟(شاہکار میگزین مئی 2001)

انسان اور کائنات کا باہمی تعلق، مذاہب کا باہمی تعلق ،مذہب اور انسان دوستی،مذہب اور معاشرہ۔جیسے موضوعات پر بنیادی سوالات اٹھائے ہیں اور ان کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔(11)

اصول دستور اسلامی (مجلہ عرفات ،مارچ 1947)

مضمون ہذا میں جن اہم ذیلی موضوعات پر مصنف نے گفتگو کی ہے وہ یہ ہیں،دستوری

"تشکیلات، بنیادی اصول شریعت اسلامی کا مسئلہ، مسلمانوں کی قانون سازی، سر ریاست، استبداد یا شوریٰ؟ شوریٰ، دستور کی محافظت، آزادیٔ رائے، مذہب اور تعلیم، ریاست اور شہری۔ (12)

احیائے ملتِ اسلامیہ، (مجلہ عرفات، مارچ 1948)

اس مضمون میں مختصراً جن اداروں کے قیام اور احیاء کی ضرورت ہے اس کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ان میں تعلیم کا نظام، مرکزی دارالعلوم کا قیام شریعت و احیائے ملی، اسلامی فقہ اور اسلامی معاشیات، اوقاف کی تمسیح اور اخلاق ملی جیسے بنیادی موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔(13)

حوالہ جات

1۔ Road to Makkah، محمد اسد، ترجمہ: طوفان سے ساحل تک، مترجم محمد الحسن صدیقی، طبع مکی کراچی ۱۹۹۴ء ماخوذ از محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ترتیب و تدوین محمد اکرم چغتائی، طبع اول 2009، ناشر پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، مطابع مکتبہ جدید پریس لاہور، ص: 17۔

2۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص: 18

3۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص:18-21 بالاختصار

4۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص:37-38

5۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص:47

6۔ معارف اعظم گڑھ، اکتوبر1934 ص:242-243 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص:394-395

7۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص:8

8۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص:8

9۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص:10-12 بالاختصار

10۔ شاہکار میگزین، مئی2001 ص:16-22 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص:292-308 (اب باضابطہ کتابچہ کی صورت میں بھی شائع ہو گیا ہے)

11۔ شاہکار میگزین، مئی2001 ص:4-16 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص:361-384

12۔ عرفات، مارچ1947 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص:290-252

13۔ عرفات، مارچ1948 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص:243-251

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد۶، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

ڈاکٹر شاکر حسین خان

Justice Peer Mohammad Karam Shah Al-Azhari was an uncontroversial, literary, spiritual man and a true leader of Muslims. He performed religious and national services on national and international level. This article is not simply based on his exaltation while it is rather a research work on him.

Peer Sahab was thought Hashmi by his believers but according to my research he was Qurashi. His duration of stay in Egypt is cited different and his tenure of judiciary is stated differently but I have a different view. His judicial decisions are told in dozens but to me his total judicial decisions are not more than a dozen. I have proved it with concrete arguments that Peer Sahab was a great literary and spiritual peronality. He was a true invitee of unity of Ummah. There is no contradiction in his sayings and acts. His thoughts and philosophy is valued to be followed.

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری المعروف ضیاء الامت کی شخصیت علمی، دینی اور روحانی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، وہ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۶ ہجری بمطابق یکم جولائی ۱۹۱۸ء شب دوشنبہ (پیر) بعد از صلوۃ التراویح (۱) بھیرہ، ضلع سرگودھا میں قریشی خاندان کے مذہبی گھرانے میں تولد ہوئے پیر صاحب کا سلسلہ نسب شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہوتا ہوا صحابی رسول محترم ہبار (ابن الاسود بن مطلب بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی) سے جاملتا ہے۔(۲)

شیخ ملتانی کے آباؤ اجداد عربی النسل اور خاندان قریش سے تھے بعض سوانح نگاروں نے شیخ ملتانی کو ہاشمی تصور کیا ہے "آپ ہاشمی ہیں اور ہاشمی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں"(۳) یہ تصور غلط فہمی کی بنا پر قائم کیا گیا ہے یہی نہیں بلکہ "پنجاب چیف اور پنجاب گزیٹر (Gazetteer) ملتان ڈسٹرکٹ اور کنگھم کی رپورٹ میں حضرت بہاء الحق کو اسدی الہاشمی ظاہر کیا گیا ہے محمد شاہ اور نادر شاہ کے ایک مشترک اعلانیہ میں جس پر ۱۷۴۵ء کی تاریخ ثبت ہے اس میں بھی آپ کو اسدی الہاشمی تسلیم کیا گیا ہے"(۴)

شیخ ملتانی کو ہاشمی تصور کرنا محبت وعقیدت پرمبنی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ "پروفیسر مولوی محمد شفیع مرحوم سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور نے اپنے مقالہ "الشیخ الکبیر بہاء الدین زکریا ملتانی" میں بھی آپ کو اسدی ہاشمی تسلیم کیا ہے"(۵)

راقم کے نزدیک ہاشمی صرف وہی ہے جو جناب عبدالمطلب بن ہاشم کی اولاد سے ہو۔ "ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "المعارف" میں لکھا ہے کہ عبدالمطلب کی اولاد کے سوا دنیا میں کوئی ہاشمی نہیں عبد المطلب بن ہاشم سے ہاشمی نسل چلی، ہاشم کے باقی بیٹے مقطوع النسل تھے، یہی نظریہ "تاریخ الخمیس" اور روضۃ الاحباب" کا بھی ہے۔(۶)

ابن حجر عسقلانی نے اپنی تصنیف (۷) میں پانچ ایسے اشخاص کا تذکرہ کیا ہے جن کے نام ہبار ہیں وہ یہ ہیں: ۱۔ہبار بن الاسود ۲۔ہبار بن سفیان ۳۔ہبار بن صیفی

۴۔ہبار بن ابی العاص ۵۔ہبار بن وہب

ان تمام صاحبان کا تعلق حضرت عبدالمطلب بن ہاشم سے نہیں اس لیے ان میں سے کوئی بھی ہبار ہاشمی نہیں۔ شیخ ملتانی کا شجرہ نسب حضرت ہبار بن الاسود بن الاسد بن عبدالعزیٰ بن قصی سے جاملتا ہے اس لیے شیخ ملتانی قریشی الاسدی ہیں۔ الاسدی الہاشمی نہیں، حضرت ہبار کا تعلق اسد بن عبدالعزیٰ سے ہے اسد بن ہاشم سے نہیں۔ اسد بن ہاشم کی صرف ایک بیٹی تھی ان کا نام فاطمہ بنت اسد ہے جوکہ جناب علی بن ابی طالب کی والدہ ہیں۔ تحریر کردہ دلائل سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ شیخ ملتانی قریشی ہیں اور پیر کرم شاہ شیخ ملتانی کی اولاد سے ہیں۔ غلط فہمی کی بناء پر ہی پیر صاحب کو بھی ہاشمی لکھا اور پکارا گیا جو غیر صحیح ہے۔

پیر صاحب کا نام "محمد کرم شاہ" ان کے دادا، پیر امیر شاہ (متوفی ۱۳۴۶ھ) نے تجویز کیا تھا۔ نام رکھنے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی کہ "پیر کھارا کوہستان نمک کے دامن میں ایک گاؤں ہے جو "پیر کرم شاہ" المعروف ٹوپی والے" کے فیض کی وجہ سے مرجع خلائق ہے اس ہستی کے ساتھ ان کے خانوادہ کی رشتہ داری بھی ہے اس لیے آپ کے جد امجد نے انہی کی نسبت سے آپ کا نام محمد کرم شاہ رکھا۔(۸)

خاندان کی روایت کے مطابق تعلیم کا آغاز قرآن کریم سے ہوا۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم، محمدیہ غوثیہ پرائمری اسکول سے حاصل کی جس کو ان کے والد پیر محمد شاہ (متوفی ۱۹۵۷عیسوی) نے ۱۹۲۵ء میں قائم کیا تھا۔ پیر صاحب اس اسکول کے پہلے طالب علم تھے اس وقت ان کی عمر سات سال تھی۔ ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ سے میٹرک کیا۔(۹) پیر صاحب اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اپنے والد کے قائم کردہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ (قائم شدہ ۱۹۲۵ء) بھیرہ میں دینی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔(۱۰)

فاضل عربی کے لیے انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور

امتحان ۶۰۰ میں سے ۵۱۲ نمبر لیکر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پورے پنجاب میں پہلی پوزیشن حاصل کی پھر ضلع ہزارہ کے شہر مانسہرہ پہنچے اور وہاں مولانا حمید الدین سے اصول فقہ کے اسباق پڑھے۔(۱۱)

۱۹۴۲ء میں دورہ حدیث کے لیے مرادآباد گئے جہاں انہوں نے سید نعیم الدین مرادآبادی سے دورہ حدیث کی چند کتابیں پڑھیں باقی کتابیں مولانا محمد عمر (والد مفتی اطہر نعیمی) سے پڑھیں۔ تکمیل ہوئی تو دیوان آل رسول سید اجمیری نے دستار باندھی۔ سند دیتے ہوئے علامہ مراد آبادی نے کہا "میں آج مطمئن ہوں کہ میرے پاس دینی علوم اورحدیث طیبہ کی جو امانت تھی وہ میں نے موزوں فرد تک پہنچادی۔(۱۲)

پیر صاحب نے مراد آباد سے آنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کا امتحان پاس کیا(۱۳) ۱۹۴۸ء میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔(۱۴) ان کا نکاح سجادہ نشین آستانہ عالیہ سیال شریف قمرالدین سیالوی نے پڑھایا۔

پیر صاحب کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے جامعہ ازہر (مصر) جائے چناں چہ وہ مئی ۱۹۵۱ء میں جامعہ ازہر مصر چلے گئے۔(۱۵) جہاں انہوں نے تین سال دوماہ (جون ۱۹۵۱تا جولائی ۱۹۵۴ء) قیام کیا۔ ان کے بعض مدح سراؤں نے قیام مصر کا دورانیہ بیان کرنے میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ درست وہی ہے جو راقم نے تحریر کیا ہے۔ پیر صاحب نے جامعہ قاہرہ میں بھی داخلہ لیا تھا۔(۱۶) اور شام کے اوقات میں جامعہ فواد بھی لیکچر سننے جاتے تھے(۱۷) پیر صاحب اپنی تحریرات ومکتوبات میں اپنے آپ کو ایم۔اے۔ جامعہ ازہر ہی ظاہر کرتے تھے۔ پیر صاحب کا یہ طریقہ رہا کہ جہاں فرصت ہوئی وہاں کچھ نہ کچھ سیکھ لیا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے مختلف دیہات اور شہروں کا دورہ کیا اور وہاں کے علماء سے درس لیا یہی طریقہ انہوں نے مصر میں بھی جاری رکھا۔

پیر صاحب نے قیام مصر کے دوران تصانیف وتالیف کا بھی آغاز کردیا تھا۔ بیان سرفروشی اور سنت خیرالانام، اسی دور میں تحریر کیں۔ وہ ڈائری بھی لکھتے تھے ان کی ڈائری میں روز مرہ کے معمولات اور اس وقت کے حالات وواقعات پر تبصرے موجود ہیں(۱۸) پیر صاحب نے

جامعہ ازہر میں ایم۔اے کرنے کے بعد جامعہ کے شعبہ تخصص فی القضاء میں ایم۔فل/پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرائی تھی۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''الحدود فی الاسلام'' تھا اور وہ یہ تحقیقی کام ڈاکٹر ایوب علی آف بنگلہ دیش کی زیر نگرانی کر رہے تھے۔(۱۹) لیکن ان کا یہ کام پائے تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور وہ یہ کام ادھورا چھوڑ کر وطن واپس آ گئے۔ راقم نے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے حوالے سے حافظ احمد بخش سے بذریعہ مکتوب دریافت کیا کہ پیر صاحب کا مقالہ ایم فل/پی ایچ ڈی کہاں ہے؟(۲۰) اس کے جواب میں انہوں نے اپنے مکتوب میں رقم کیا کہ ''قبلہ پیر صاحب کے مقالہ کا اکثر مواد مصر میں ہی رہ گیا تھا۔ مزید اس کے بارے میں پتہ نہیں''(۲۱)

پیر صاحب وطن واپس آنے کے بعد اپنے والد کی تیمارداری میں لگ گئے۔ کچھ وقت ملتا تو دارالعلوم میں زیر تعلیم طلبہ کو اسباق پڑھاتے یا اپنی زمینوں کی دیکھ بال کرتے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ جس دن ان کے والد کا چہلم تھا اس دن انہوں نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔(۲۲) اور ایسا نصاب متعارف کرایا جو قدیم وجدید علوم کا حسین امتزاج تھا سب سے پہلے انہوں نے ہی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں باقاعدہ طور پر اپنی فہم وفراست سے دینی مدارس (اہلسنت) کے لیے عصری تقاضوں کے مطابق دس سالہ نصاب ترتیب دیا۔ اس نصاب میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم منطق، علم الکلام، علم بلاغت، علم صرف، علم نحو کے ساتھ جدید علوم، انگریزی لٹریچر، علم سیاسیات اور علم اقتصادیات کو خصوصی اہمیت دی۔ اس کے علاوہ مختلف بورڈز سے اپنے دارالعلوم کے طالب علموں کو انٹر میڈیٹ، بی اے اور مختلف مضامین میں ایم۔اے کا امتحان دلوانے کا اہتمام کیا اس کے علاوہ ان کے دارالعلوم کے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم مختلف اسکالرشپ کے تحت مزید تحصیل علم کے لیے بیرونی ممالک جانے لگے۔ انہوں نے اپنے دارالعلوم میں تعلیمی ترقی کے ساتھ اخلاقی تربیت کا بھی اہتمام کیا۔

پیر صاحب ایک طرف تو دارالعلوم کے مہتمم تھے اور دوسری جانب روحانی پیشوا بھی۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم وتربیت واصلاح ملت کے لیے دونوں مناسب کا استعمال کیا۔ انہوں نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کی ڈگر پر ملک کے متعدد شہروں اور قصبوں میں مختلف ناموں سے دینی

جامعات قائم کیں۔ ان جامعات سے فارغ التحصیل علماء ملک کے مختلف حصوں اور دنیا کے متعدد ممالک میں دین کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

پیر صاحب نے روحانی پلیٹ فارم سے بھی اپنی خدمات پیش کیں اور خانقاہی نظام میں اصلاحات نافذ کیں انہوں نے اپنی خانقاہ سے منسلک افراد کی دینی، روحانی اور معاشرتی سطح پر اصلاح کی کوشش کی، انہوں نے اپنے احباب کو تمام متعلقین کی فہرست تیار کرنے کا مشورہ دیا انہوں نے اپنی خانقاہ سے منسلک افراد کی توجہ اجتماعی مفادات کے حصول کی جانب مبذول کرائی، انہوں نے اپنے اصلاحی مشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اگر ان لوگوں کی اصلاح میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی تو پھر عام دعوت دی جاسکتی ہے۔(۲۳)

انہوں نے اپنا پلان بتاتے ہوئے کہا کہ ''مندرجہ ذیل پہلو خصوصی اہتمام کے مستحق ہیں: ۱۔صحیح عقائد ۲۔اخلاق حسنہ ۳۔تعلیم ۴۔معاشی حالت ۵۔صحت بدنی(۲۴)

ہمارے مذہبی مدارس میں اسلام کے بنیادی عقائد پر کم اور مخصوص نظریات وفروعی اختلافات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، تعلیم صرف اسناد کے حصول کے لیے رہ گئی ہے اس کا عمل سے تعلق منقطع ہوگیا ہے، پاکستانی معاشرے میں انفرادی طور پر معاش کی فکر کی جاتی ہے لیکن اجتماعی فکر کی ضرورت ہے لوگ اپنے ماتحتوں کو بھول جاتے ہیں پھر بھی چند لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فضل وکرم میں دوسروں کو بھی شامل کر لیتے ہیں جس سے ضرورت مندوں کا بھلا ہوجاتا ہے۔

ہمارے مذہبی اور عصری تعلیمی اداروں میں اخلاق حسنہ پر خصوصی توجہ نہیں دی جاتی اور نہ ہی بچوں کے سرپرست اخلاق وآداب سکھاتے ہیں اسلام میں تعلیم کی پہلی سیڑھی ادب واحترام ہے ایک روایت میں ہے کہ ''پہلے ادب سیکھو پھر علم حاصل کرو''۔ جہاں تک صحت کی بات ہے تو اس معاملے میں نہ تو حکومتی سطح پر کوئی خاص اہتمام کیا جاتا ہے نہ تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جاتی ہے اور نہ ہی والدین اور سرپرست اپنے بچوں کی صحت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ یقیناً پیر صاحب کی یہ فکر لائق داد ہے۔

پیر صاحب مزید کہتے ہیں کہ ''اپنے تمام پیر بھائیوں کو نماز کا ترجمہ، عقائد اور اخلاق

سے متعلق چار مختلف مختصر آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ اور متن یاد کرانا چاہیے تاکہ وہ عملی زندگی ان کی ہدایت اور ان کی روشنی میں گزار سکیں۔ جمعوں کے خطبوں میں بھی یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ حاضرین کو ہر بار کوئی مختصر سی آیت یا حدیث جس کا تعلق عملی زندگی سے ہو یاد کرانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ جب انھیں تو کچھ ٹھوس چیز لے کر اٹھیں۔(۲۵) ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیر صاحب نے ایک منصوبہ بندی کے تحت دینی، مذہبی اور معاشرتی خدمات سرانجام دینے کا آغاز کیا۔ وہ اپنی مہم میں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے ان کی یہ مہم پاکستان تک محدود نہ رہی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ان کے نمائندوں نے جزوی طور پر اس مہم کو فعال بنانے کی کوشش کی۔ ان کے ادارے کے تحت مختلف سماجی تنظیمیں فلاحی کاموں میں مصروف ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر خانقاہوں سے بھی اس طرح کی اصلاحی تحریکوں کا آغاز کیا جائے تاکہ قومی سطح پر غربت، ناخواندگی، بد اخلاقی اور بے راہ روی پر قابو پایا جا سکے۔

پیر صاحب نے چند پیر صاحبان سے درخواست کی تھی کہ وہ سجادہ نشینوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھالیں تاکہ ان کی سعی سے خانقاہی نظام پر جو بدنما داغ لگے ہوئے ہیں وہ صاف ہو جائیں پیر صاحب خانقاہی نظام کی اصلاح کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار وقتاً فوقتاً کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ پیر کا لفظ لکھتے تھے وہ کہتے تھے "جب میں اپنے نام کے ساتھ "پیر" کا لفظ لکھتا ہوں تو محسوس یہ کرتا ہوں کہ مجھے اپنے قلم سے اپنے نام کے ساتھ یہ نہیں لکھنا چاہیے اس طرح اس میں یک گونہ ذاتی ستائش کا پہلو نکلتا ہے لیکن پھر بھی صرف اس لیے لکھنے پر مواظبت اختیار کرتا ہوں تاکہ لوگوں کو یقین حاصل ہو جائے کہ پیر بھی عالم دین ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ دین کا عظیم ترین عالم ہونا ہی پیری کی بنیاد ہے"(۲۶)

پیر صاحب کا تعلق سلسلہ چشتیہ سے تھا اس سلسلے میں محفل سماع کا انعقاد بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے محفل سماع کے انعقاد میں علماء کا اختلاف ہے بعض جائز سمجھتے ہیں بعض چند شرائط کے ساتھ جائز سمجھتے ہیں اور بعض جائز نہیں سمجھتے۔ سلسلہ چشتیہ میں مروج قوالی میں آلات موسیقی استعمال ہوتے ہیں ذخیرہ حدیث میں ہمیں دو طرح کی روایات ملتی ہیں ان میں ایک قسم ان روایات کی ہے جو آلات موسیقی کے استعمال کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں اور دوسری قسم ان

روایات کی ہے جن میں آلات موسیقی کے استعمال کو ممنوع سمجھا گیا ہے۔ پیر صاحب سماع مع مزامیر کو جائز سمجھتے تھے۔ حافظ احمد بخش نے راقم کو ٹیلیفون پر بتایا کہ "حضور ضیاء الامت علیہ الرحمہ سماع میں مزامیر کے قائل تھے لیکن وہ بغیر ساز کے سماعت فرماتے تھے"(۲۷) پیر صاحب نے سورہ لقمان کی آیت نمبر ۶ کے تحت لکھا ہے کہ "ہر غنا حرام نہیں بلکہ بعض ایسے مقامات بھی ہیں جہاں اس کی اباحت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے(۲۸)

پیر صاحب ایک بڑے قلم کار اور لکھاری بھی تھے، انہوں نے دینی صحافت میں بھی نام پیدا کیا، انہوں نے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ ضیائے حرم لاہور کا اجراء کیا جو آج تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے، اس کے ادارے "سر دلبراں" کو پذیرائی حاصل ہوئی جس میں انہوں نے پاکستان کے سیاسی، مذہبی معاشرتی اور معاشی تجزیے کئے اس میں پیر صاحب کے کئی علمی تحقیقی اور معلوماتی مضامین شائع ہوئے اس پرچے کے متعدد خاص نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں۔

پیر صاحب، صاحب تصانیف بھی تھے ان کی تصانیف میں سب سے مشہور تفسیر ضیاء القرآن (مکمل پانچ جلدیں) ہے مذکور تفسیر عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور عہد دوراں کی عمدہ و معیاری اردو تفاسیر میں سے ایک ہے پیر صاحب نے قرآن کریم کا مکمل اردو ترجمہ بھی کیا اگرچہ وہ تفسیر قرآن کا حصہ ہے لیکن اسے "جمال القرآن" کے نام سے الگ بھی شائع کیا گیا ہے۔ پیر صاحب نے قرآن کریم کی بعض آیتوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں ضیاء النبی (مکمل سات جلدیں) بھی ادبی شاہکار ہے ان کی اس کاوش پر حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر نے صدارتی ایوارڈ بھی دیا۔ ان کی دیگر علمی کاوشوں میں سنت خیر الانام، مقالات (دو جلدیں) مرتب حافظ احمد بخش، خطبات (مرتب خلیفہ ملک مختار احمد مجاہد)، ملفوظات (مرتب محمد اکرم ساجد)، مکاتیب (مرتب محمد اعجاز احمد گوندل)، ترجمہ و شرح قصیدہ اطیب النغم، مجموعہ وظائف اور دیگر بڑی چھوٹی کتب، رسائل اور مختلف نوعیت کے مضامین شامل ہیں ان کی شخصیت جس صداقت سے عبارت تھی اس کا اظہار ان کی تحریرات میں نمایاں نظر آتا ہے۔

محمد کرم شاہ ان دو میں سے ایک تھے جن کے بارے میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سابق

صدر جنرل محمد ضیاء الحق (ش۔۷/اگست ۱۹۸۸ء) نے کہا تھا کہ ''انہیں سونے میں تولا جاسکتا ہے'' جنرل ضیاء ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہیں ۱۹۸۰ء میں ستارہ امتیاز کا ایوارڈ پیش کیا اور جون ۱۹۸۱ء میں انہیں وفاقی شرعی عدالت کا جسٹس مقرر کیا۔

جسٹس (ر) امجد علی سابق جوائنٹ سیکریٹری وزارت قانون رقم طراز ہیں: ''حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ کی تقرری جنرل ضیاء الحق نے کی آپ علماء بنچ کے پینل میں فیڈرل شریعت کورٹ میں (جو پہلے شریعت بنچ تھا) آئے پیر صاحب کا چونکہ دینی علم ومطالعہ بڑا وسیع تھا لہٰذا تصاص ودیت کا قانون بنانے کے لیے پیر صاحب سے راہنمائی لی گئی۔ اس قانون کے کئی پیچیدہ گوشے تھے جنہیں حل کرنے کے لیے ہماری بیٹھیں ہوتی تھیں۔ تاہم تصاص ودیت کو قانونی حیثیت دینے میں پیر صاحب کا کافی حصہ ہے ہم تمام دینی پہلوؤں کے حوالے سے آپ سے ہی راہنمائی حاصل کرتے تھے پیر صاحب کے علم کی انتہا نہیں تھی میں خود بے شمار دینی معاملات میں آپ سے مستفیض ہوا'' (۲۹)

پیر صاحب عدالتی مناصب (۳۰) پر زیادہ سے زیادہ سترہ سال ایک ماہ تک فائز رہے(۳۱) اس عرصے کے دوران انہوں نے متعدد فیصلے کیے جو پاکستانی عدالتی وقانونی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان کے ان تاریخی عدالتی فیصلوں کی روشنی میں وزارت قانون حکومت پاکستان نے آئین پاکستان سے چند ایک دفعات پیر صاحب کی تحقیق یا علم یا نظریے کے مطابق غیر اسلامی تھیں حذف کیں۔ حافظ احمد بخش ان فیصلوں کے عنوانات کی فہرست بناتے ہوئے رقم طراز ہیں ''حد رجم، قانون شفعہ، زرعی اصطلاحات، جبری ریٹائرمنٹ، قبضہ مخالفہ، انعامی بانڈز، صنعت فلم سازی، شناختی کارڈ کے لیے تصاویر اور ان جیسے درجنوں موضوعات ہیں جن پر آپ کے فیصلے پاکستانی عدلیہ کے لیے روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔(۳۲)

حافظ صاحب کی دیگر درجنوں موضوعات سے کیا مراد ہے؟ ہمیں اس کے بارے میں آگہی حاصل نہ ہوسکی البتہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز نے مارچ ۲۰۰۳ء میں ''ضیاء الامت کے عدالتی فیصلے'' کے عنوان سے ۲۱۸ صفحات پر مشتمل کتاب کی اشاعت کی، مذکورہ کتاب سے بھی صرف انہیں چند عنوانات کے نام معلوم ہوسکے جن کی تعداد ایک درجن بھی نہیں۔ ہماری رسائی ان گزیٹر

(Gazetteer) تک نہ ہوسکی جن کے بارے میں جنرل محمد ضیاء الحق نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وفاقی شرعی عدالت کے دیئے گئے فیصلوں کو گزیٹر کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔(۳۳)

پیر صاحب کے عدالتی فیصلوں کا جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے عموماً فقہ حنفی کی روشنی میں اپنے فیصلے رقم کیے۔ جدید مسائل کے حل کے لیے اجتہاد سے بھی کام لیا جو جزوی تھا۔ انہوں نے مسائل کے حل کے لیے قرآنی آیات سے استدلال کیا کہیں کہیں ایسی حدیثوں کی نشاندہی بھی کی جو غیر صحیح ہیں۔ اکثر ایسی حدیثوں پر اعتماد کیا جو فقہ حنفی کے عین مطابق ہیں ان کی عدالتی وفقہی خدمات کا محور فقہ حنفی کی تعلیمات رہا۔ خلاق شکاشہ کے مسئلہ میں انہوں نے قدیم علمائے احناف سے اختلاف بھی کیا ہے۔(۳۴)

پیر صاحب کی علمی وفقہی خدمات کا دائرہ پاکستان تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے عالمی سطح پر دین کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا، انہوں نے اپنے اخلاق وکردار سے قوم وملت کا سر فخر سے بلند کیا اسلام اور پاکستان کا نام روشن کیا، اس سلسلے میں انہوں نے متعدد ممالک کے سرکاری وغیر سرکاری دورے کیے۔

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں جمعیت علمائے پاکستان (JUP) کی جانب سے مولانا شاہ احمد نورانی (متوفی ۱۱/دسمبر ۲۰۰۳ء) کے ہمراہ ڈھاکہ کا دورہ کرکے وہاں کے حالات کا جائزہ لیا اور ملک کے خلاف ہونے والی سازشوں سے حکومت پاکستان کو آگاہ کیا۔(۳۵)

۳/جون، ۱۹۷۹ء کو وفاقی وزیر داخلہ کے ہمراہ روس جاکر وہاں کے مسلمانوں کے حالات کا مشاہدہ کیا اور وہاں کے مقامی علماء سے ملاقات کی۔(۳۶)

اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل محمد ضیاء الحق کی خواہش پر ہیومن رائٹس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جنیوا گئے اور مرزائیوں کے متعلق حکومت پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کی۔(۳۷) پیر صاحب کی حکمت عملی اور دوراندیشی کے باعث قادیانی جو اس وقت عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کرنے کی سازش کررہے تھے ناکام ہوگئے۔ پیر صاحب مہم میں کامیاب ہوئے لیکن انہیں اس مشن پر بھیجنے والا ایک فضائی حادثے کا شکار ہوگیا۔ یقیناً جنرل ضیاء کا جنیوا کے لیے پیر صاحب کا انتخاب کرنا راقم کی نظر میں ضیاء صاحب کی بڑی نیکی ہے۔

پیرصاحب کئی مرتبہ مصر بھی گئے جب وہ ۶/ مارچ ۱۹۹۳ء میں چھٹی مرتبہ مصر پہنچے تو وہاں کے صدر حسنی مبارک نے انہیں نوط امتیاز کا اعزاز پیش کیا یہ اعزاز انہیں ان کی دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دیا گیا۔(۳۸) وہ کئی مرتبہ تبلیغی مہم پر امریکہ بھی گئے تھے جب دوسری مرتبہ ۱۹۹۴ء میں امریکہ پہنچے تو نیوجرسی کے میئر نے ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا اور اپنے روایت کے مطابق شہر کی چابی بطور اعزاز ان کی خدمت میں پیش کی اور ساتھ ہی قرآن کریم کی تفسیر اوردیگر دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی طرف سے انہیں اعتراف عظمت کا سرٹیفکیٹ پیش کیا۔(۳۹) یہ مسلمانوں اورخصوص پاکستانیوں کے لیے باعث افتخار اور اعزاز کی بات ہے کہ نیوجرسی کے میئر نے ایک پاکستانی اسلامک اسکالر کو ان اعزازات سے نوازا۔

پیرصاحب علم دوست، دین کے علم بردار، بریلوی مسلک کے اعتدال پسند عالم، روشن خیال انسان، اتحاد بین المسلمین کے داعی اور فرقہ واریت کے مخالف تھے۔ انہوں نے کبھی کسی مسلمان کی تکفیر نہیں کی اسی وجہ سے بعض علماء نے ان سے اختلاف کیا اور ان کی اس روش سے خفا بھی ہوئے اور اپنی ناراضگی کا اظہار تحریر وتقریر کی صورت میں کیا ان کے بعض ہم عصر مذہبی رہنماؤں کا یہ وتیرہ رہا ہے کہ ایک دوسرے کو کافر ومشرک قرار دیتے تھے لیکن پیرصاحب مذہبی انتہا پسندی سے سیکڑوں میل دور تھے یہی وجہ ہے کہ مختلف مسالک کے روشن خیال علماء انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں عالم اسلام کا فرد سمجھتے تھے۔

پیرصاحب کا یہ طریقہ رہا کہ اپنے بزرگوں کے ساتھ دیگر مسالک کے اکابرین کا بھی ادب واحترام کرتے تھے ان کی نظر میں اپنے اور پرائے کے درمیان تفریق نہ تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریرات میں علامہ، مولانا جیسے القاب ہر مسلک کے علماء کے لیے پائے جاتے ہیں وہ اپنے مخالفوں سے بھی حسن اخلاق سے پیش آتے تھے وہ اختلافی مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرتے اپنا موقف بیان کرنے میں شدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہوئے حتی الامکان کوشش کرتے کہ اختلافی مسائل میں وہ راہ اختیار کی جائے جس کو اختیار کرنے سے اختلاف ختم ہوجائے اور کسی قسم کی رنجش باقی نہ رہے ان کی شخصیت پر ہمیشہ

جمالی رنگ غالب رہا جلالی رنگ ان کی طبیعت اور فکر دونوں سے موافقت نہیں رکھتا تھا۔ پیرصاحب نے کسی کتاب کے مصنف اور نہ ہی قرآن کریم کا ترجمہ کرنے والے کسی مترجم پر کفر کا فتوی لگایا بعض حضرات نے ان پر مسلکی رنگ جمانے کی کوشش کی اور اپنے مخالفین کے لیے پیرصاحب کی جانب سے ایسے جملے منسوب کیے جو ان کی فکر ونظر اور علم وعمل سے لگا نہیں کھاتے۔ محمد عبدالحکیم شرف قادری نے لکھا ہے کہ ''کسی نے پیرصاحب سے کہا کہ حسام الحرمین میں جن گستاخوں کے بارے میں فتوی ہے آپ نے ان پر کفر کا فتوی نہیں لگایا، پیرصاحب نے کہا ٹھیک ہے تاہم میں یہ کہتا ہوں کہ ان لوگوں کا حشر ابوجہل اور ابولہب کے ساتھ ہوگا''(۴۰)

محمد اکرم ساجد فاضل دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ(۴۱) پیرصاحب کا قول نقل کرتے ہیں کہ پیرصاحب نے فرمایا کہ ''کسی کو گستاخ رسول کہنے کا دور گزر گیا'' (۴۲) کسی حد تک یہ بات درست ہے۔ عصر حاضر میں جس کو دیکھو سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اس طرح کی باتوں کو شہ دیتا ہے اور اپنے مخالفین کے لیے اس طرح کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔

ماضی میں دوسروں کے اکابرین کی تذلیل کا دوسرا طریقہ یہ رائج تھا کہ ان کے بچپن کے واقعات اور نادانی کے قصوں کو نہایت ہی قبیح انداز میں بیان کیا جاتا تھا، اس تناظر میں پیرصاحب کا یہ قول ملاحظہ کیجئے ''اس سے بڑھ کر بے انصافی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص کے طالب علمی کے زمانے کی کوتاہیاں بیان کرکے اس کی علمی بزرگی اور اخلاقی فضیلت پر زبان طعن دراز کی جائے''(۴۳) الغرض پیرصاحب نے ہر اس طرز عمل کی مذمت کی جو ملت اسلامیہ میں انتشار وافتراق کا سبب بنتا ہو۔ جب بھی پاکستانی مسلمانوں نے اتحاد کی ضرورت محسوس کی پیرصاحب ان کی کوشش میں کسی سے پیچھے نظر نہیں آئے، تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء اور تحریک نظام مصطفی ۱۹۷۷ء میں قوم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئی تو پیرصاحب نے اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، فروری ۱۹۷۶ء کے اداریہ صفحہ سر دلبراں میں پائیدار اتحاد کے لیے اپنا پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا۔ وہ کسی بھی اتحاد کی ناکامی سے ناامید نہیں ہوئے بلکہ وہ اتحاد امت کے لیے سعی کرتے رہے۔

انہوں نے ملت اسلامیہ کے اتحاد کا مرکز ومحور قرآن کریم کو قرار دیا ہے اور حقیقت بھی